حالات کی رفتار جس طور پر رہی ہے اس سے نئے سوالوں کے غلط جوابات کا کھوکھلا پن ظاہر ہو گیا ہے۔ یہ کام ذہین اور تخلیقی صلاحیت رکھنے والے افراد کا ہے کہ وہ نئے چیلنج اور نئے مسئلوں کا اطمینان بخش حل پیش کریں، اس کام کے لئے زمین تیار ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس میں کیسا بیج ڈالتے ہیں۔ بہرحال ایسے آثار ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ذہنی اور اخلاقی مسائل پر سنجیدگی اور معقولیت سے سوچا گیا ہے۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ اسلام کی ایسی تفسیر و تشریح کے لئے جو مسلم اقلیت کے موجودہ مسئلوں کے حل کرنے میں مدد دے، رہنمائی اور لیڈرشپ کی اشد ضرورت ہے۔ ایسی لیڈرشپ جو سوچ، مسائل حاضرہ کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں دماغ سوزی کرے اور ذاتی اعمال و افکار سے اپنے ڈھونڈھے ہوئے مداوا کی معقولیت ثابت کرے۔ اگر پچھلے انتشار آفریں تعصبات کو خیرباد کہنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی کوئی تعمیری اور مثبت تفسیر سامنے نہ آئی تو مسلمان ایک متلاطم سمندر میں اپنے آپ کو بے سہارا پائیں گے۔

سیاسی میدان میں مسلمانوں کی رہنمائی ان قوم پرست مسلمانوں نے کی ہے جو ۱۹۴۷ء سے قبل اس بات کی تبلیغ کرتے تھے کہ مسلمانوں کو ہندوستان کی عام قومی تحریک کا ساتھ دینا چاہیئے اور خاص طور سے کانگرس میں شریک ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ جہاں تک مسئلہ کے ایک خاص پہلو کا تعلق ہے نئے حالات میں ان قوم پرستوں کی سرگرمیاں بڑی حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔ لیکن اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ بات واضح ہے کہ اتنا اہم معاملہ محض سیاسی بنیادوں پر طے نہیں ہو سکتا۔

مذہبی میدان میں خاص طور سے دو طرزِ فکر پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک جماعت اسلامی کا طرزِ فکر ہے جو زیادہ اہم نہیں۔ اس کا تعلق پاکستان کی جماعت اسلامی سے ہے جو مودودی صاحب کی رہنمائی میں کام کر رہی ہے۔ یہ گروپ آج بھی کبھی کبھی کچھ جوش پیدا کر دیتا ہے لیکن امید کم دلاتا ہے۔ "دو قومی نظریہ" کے ساتھ جو سیاسی اور سماجی رجحانات وابستہ تھے انھیں یہ جماعت روایتی مذہبی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس جماعت کے پروگرام میں نئے سیاسی حالات کے تحت کچھ

تبدیلیاں کی جارہی ہیں۔ اس کا خاص آرگن ماہنامہ زندگی (رام پور) رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ جماعت فائدہ میں ہے کہ جذباتی طور پر اپنا رشتہ ماضی سے جوڑے ہوئے ہے اور جرأت کے ساتھ پچھلے عہد و پیمان کو نباہ رہی ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، مسلمانانِ ہند کی دلچسپی اور آمادگی اس کے لئے روز بروز کم ہوتی جارہی ہے کہ وہ کسی ایسی "تفسیرِ حیات" کی حمایت کریں، خواہ وہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، جو عملی طور پر تباہ کن ثابت ہوچکی ہو اور عصرِ حاضر کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی تقاضوں سے بے تعلق ہو۔ یہ سچ ہے کہ اگر ترقی پسند لبرل ازم پورے طور پر ناکام ہوجائے اور ہندوستان میں سیکولرازم پھول پھل نہ سکے یہاں تک کہ ہندوؤں کی فرقہ وارانہ ذہنیت اپنی تمام تر مخصوص خشونت کے ساتھ فضا پر چھاجائے تب شاید یہ ممکن ہو کہ اسلامی فرقہ واریت کی یہ نشاۃ ثانیہ ایسی شکل اختیار کرے جس کے سہارے مسلم اقلیت ہندوستان کے انتشار میں شریک کار بن سکے۔

دوسرا طرزِ فکر جمعیۃ العلماء ہند کا ہے جس نے مسلمانوں کی رہنمائی مقابلتاً زیادہ تعمیری طور پر کی ہے۔ روایتی قسم کے علماء کی یہ جماعت گذشتہ چالیس سال سے برابر ہندوستانی قومیت کا جھنڈا بلند کئے ہوئے ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ نئے اعتماد اور نیم حکومتی سہارے کے ساتھ میدان میں آئی اور یہ نظریہ ایک بار پھر بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا کہ مسلمانان ہند کی فلاح قوم پرورانہ حکمت عملی میں ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ سیاسی پارٹی نہیں ہے لیکن اس کے رہنما پارلیمنٹ کے ممبر اور وزیر رہے ہیں۔ مذہبی جماعت کی حیثیت سے اس کی تنظیم کا دامن ہندوستان کے گاؤں گاؤں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا خاص ترجمان اردو کا مشہور روزنامہ الجمیعۃ (دہلی) ہے۔

جمعیۃ العلماء نے اپنے سیاسی پلیٹ فارم کو دینی اساس بھی دی ہے یا کم از کم اسے واضح طور پر اسلامی رنگ میں پیش کیا ہے۔ جمعیۃ کے لوگ "معاہدہ" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں پیغمبرؐ اسلام کی مدنی زندگی کے اولین برسوں کے اس "معاہدہ" کی سنت پر عمل کرتے ہیں جو آپؐ نے مدینہ منورہ کے یہودیوں سے کیا تھا۔ ان کا موقف[1] یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے ہندوؤں اور

[1] جیسا کہ مصنف سے ایک نجی گفتگو میں (دہلی۔ مارچ ۱۹۵۶ء) جمعیۃ کے بعض رہنماؤں نے، خاص طور سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے، تشریحاً بیان کیا۔

مسلمانوں نے یہ معاہدہ کیا کہ وہ سیکولر اسٹیٹ قائم کریں گے۔ ہندوستان کا دستور جس کی تائید مسلمانوں کے منتخبہ نمائندوں[ل] کی طرف سے متفقہ طور پر ہوئی ہے اور جس کی وفاداری کی انھوں نے قسم کھائی ہے، دراصل اسی معاہدہ کی قانونی شکل ہے۔ اس طرح، اب ان لوگوں کی رائے میں، مسلمانانِ ہند کا یہ اسلامی فریضہ ہے کہ وہ ہند کے دستورِ اساسی کے وفادار رہیں اور ایک تسلیم شدہ اقلیت کی حیثیت سے قومی زندگی کی سرگرمیوں میں اسلامی نظام کے ایسے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کو اجاگر کریں جنھیں موجودہ صورت میں براہِ راست عمل میں لایا جا سکتا ہے اور ایسے سماجی، معاشی اور انتظامی پہلوؤں کو سامنے لائیں جنھیں پوری قوم جمہوری طریقۂ کار کے ذریعہ اپنا سکے۔

سوچنے کے یہ دو طریقے ہیں، ان سے ہم بعد میں بحث کریں گے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جمیعۃ کے دو کمزور پہلو ہیں۔ اس نے تحریک مسلم لیگ کی مخالفت کی اور ان جذبات اور حوصلوں کو رد کر دیا جن پر اس تحریک کی بنیاد تھی۔ اس قسم کی جذباتی ہنگامہ آرائی سے وہ الگ تھلگ رہی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ گروہ مسلمانوں کی ان گہری اندرونی امنگوں سے بھی بے تعلق رہا جن کی بنیادوں پر مسلم لیگی جذباتیت اور حوصلہ مندیوں کا ڈھانچہ غلط طریقہ سے تعمیر کیا گیا تھا۔ غالباً یہ دوسری بات زیادہ اہم ہے کہ علماء، باوجود اس کے کہ وہ سیاسی لحاظ سے حقیقت پسند اور ان کے لیڈر کافی ذہین ہیں، عام طور سے "جدیدیت" (عصر حاضر کے نئے تقاضوں اور نئے رجحانات وخیالات) کی تعلیم سے ناآشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس اہم مسئلہ میں کہ "جدیدیت میں کسطرح ہم آہنگی پیدا کی جائے، مسلمانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد مسئلہ کے اس پہلو کو لیجئے جس کی نوعیت تہذیبی ہے۔ مسلمانوں کے پڑھے لکھے اور سوچنے والے طبقہ کے افراد کی اکثریت پاکستان چلی گئی اور بہت کم لوگ ہندوستان میں رہ گئے۔ ان میں سے چند لوگوں نے اس میدان میں قیادت کی ہے اور انھوں نے خاص توجہ ہندوستانی تمدن میں خوش گوار ہم آہنگی کی جو صلاحیت ہے اس طرف دی ہے۔ اس تمدن میں اسلام کا تمدنی

ل دستور ساز اسمبلی میں جس نے کہ دستور کا مسودہ تیار کیا اور پھر دستور کو اپنایا، مسلمانوں کے جو نمائندہ تھے وہ تقسیم ہند سے پہلے فرقہ وارانہ نمائندگی کے اصولوں پر منتخب ہو کر آئے تھے۔

عنصر نہ تو بے تعلق رہے گا اور نہ نظر انداز یا فنا کیا جا سکے گا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ایک اہم اور بُنیادی پارٹ ادا کرے گا۔ اس تہذیبی مسئلہ کو تاریخی پس منظر اور ذہنی مواد ملا ہے ہمایوں کبیر اور عابد حسین ایسے مصنفوں کی تحریروں [1] سے۔ آج کل اس مسئلہ نے زبان کے اہم معاملہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستانی قوم "ہندی" کو قومی زبان اس طرح بنائے گی کہ اردو کو چھانٹ کر الگ کر دے اور اس کو اپنا تہذیبی سرمایہ سمجھنے کے بجائے پس پشت ڈال کر آگے بڑھ جائے؟ کیا اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے والے مسلمان ہندی کو اپنی زبان کا بدل سمجھ کر اس کی مخالفت کریں یا اس کے آگے ہتھیار ڈال دیں گے؟ یا یہ کہ وہ اسے سیکھیں گے جیسا کہ ان کے تعلیم یافتہ طبقہ نے انگریزی سیکھی ہے یعنی ایک اور زبان کی حیثیت سے تاکہ وہ ایک وسیع تر حلقہ کی سرگرمیوں میں شریک ہو سکیں؟

بہرحال، جیسا کہ عابد حسین نے باوجود زبان کے پہلو پر زور دینے کے، تسلیم کیا ہے اور جرأت کے ساتھ بحث کی ہے، زبان کا سوال درحقیقت ایک زیادہ وسیع اور گہرے مسئلہ کا صرف ایک جزو ہے۔

اب ہم اس بات کو پھر چھیڑتے ہیں جس سے ہمیں بُنیادی طور پر دلچسپی ہے، یعنی مذہبی مسئلہ ــــ تاریخ اسلام کی رواں دواں رَو میں ہندی مسلمانوں کا ایک مذہبی گروپ کی حیثیت سے وجود ــــ یہاں ہم اس امکان کی طرف پھر اشارہ کرتے ہیں کہ آئندہ پچاس برسوں میں ہندی "اسلام" "پاکستانی اسلام" کے مقابلہ میں زیادہ تخلیقی ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کام آسان نہیں ہے۔ بلکہ مشکل اور آزمائشوں سے بھرا ہوا ہے۔ بہرحال اگر یہ امکان صحیح ثابت ہوتا ہے تو یہ نتیجہ ہوگا ان تلخ دشواریوں کا جو ایک زیادہ بڑی دنیا میں مسلم اقلیت کی شرکت اور "جدیدیت" کے گوناگوں مسائل سے نبرد آزما ہونے سے پیدا ہوں گی۔

---

[1] ملاحظہ کیجئے ہمایوں کبیر کی کتاب The indian Heritage بمبئی، سنہ ۱۹۵۵ء اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی کتاب ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب تین جلدیں، دہلی، سنہ ۱۹۴۶ء۔ اردو میں اس کا ملخص اور نظرثانی کیا ہوا نسخہ (سنہ ۱۹۵۶ء) جو مصنف کو نہ مل سکا اور انگریزی میں The National Culture of India بمبئی، سنہ ۱۹۵۶ء

یہ مسئلے گہرے ہیں، دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے یہ سوال ہے کہ وہ کس طرح اپنے مذہبی عقائد کو "جدیدیت" کے تصورات سے ہم آہنگ کریں، مزید برآں ہندوستان میں ان کی مخصوص اقلیتی حیثیت ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس سلسلہ میں جمعیۃ العلماء کا کیا موقف ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا مسلمانانِ ہند بھی اسے تسلیم کرتے ہیں یا نہیں اور یہ کہ یہ کہاں تک مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تاریخِ اسلام میں اس نوعیت کی یہ انوکھی صورت حال ہے۔

سیاسی اقتدار اور اجتماعی تنظیم کا مسئلہ اسلام میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ماضی میں یہ ہوتا رہا ہے کہ مسلمان یا تو صاحبِ اقتدار رہے ہیں یا اقتدار سے محروم رہے ہیں۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سیاسی اقتدار و طاقت میں وہ کسی دوسرے کے شریک و سہیم رہے ہوں[1] اور نہ تو وہ آج پاکستان میں اپنے سیاسی اقتدار میں کسی کو شریک کرنے کے لئے تیار ہیں یہاں تک کہ وہ چھوٹی اقلیت کے ساتھ بھی یہ شرکت گوارا نہیں کرسکتے[2]۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا مسلمان اپنی کسی اسٹیٹ کے بغیر بھی پورے طور پر مسلمان ہوسکتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے مسلمانوں نے ابھی حال میں پورے یقین کے ساتھ "نہیں" کہا ہے۔ اگر ہم نے صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ اسلام کے اہم واقعات کا تجزیہ صحیح

---

[1] جہاں تک مدینہ کے یہودیوں کا تعلق ہے جن سے کہ "معاہدہ" کیا گیا تھا، اقتدار میں مسلمان اور یہود شریک نہیں تھے۔ یہ ایک سمجھوتہ تھا اس غرض کے لئے کہ ہر گروہ اپنی منشا کے مطابق اور اپنے طریقہ سے زندگی گذارے۔ عہدِ حاضر میں لبنان کی بھی ایک مثال ہے جو ۱۹۴۶ء سے ری پبلک ہے اور جہاں برائے نام عیسائی اکثریت میں ہیں، اور اس طرح بہت چھوٹے پیمانے پر لبنانی مسلمانوں کی وہی پوزیشن ہے جو ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کی ہے۔ لیکن وہاں بھی مسائل ہیں، اہم اور گہرے جو ابھی تک حل نہیں کئے جاسکے ہیں۔ اس کے علاوہ اور ملک بھی ہیں مثلاً برما جہاں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی اقلیتیں سیاسی لحاظ سے مطمئن اور ترقی پذیر ہیں۔ لیکن ان مثالوں سے ہمارے اٹھائے ہوئے سوال کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

[2] یہ بات ابھی تک (یعنی اس مقالہ کے لکھنے کے وقت تک) طے نہیں ہوئی ہے کہ آیا پاکستان کے مسلمان ہندو اقلیت کے ساتھ مخلوط انتخاب کے اصول کو مانیں گے یا نہیں۔ مذہبی جماعتوں کی طرف سے اس کی پُرزور مخالفت کی جارہی ہے۔

کیا ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند و پاکستان کا یہ منفی جواب اپنے پیچھے روایتی مذہب کا بڑا وزن رکھتا ہے۔ جیسا کہ ہمارا مطالعہ ہے اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو شریعت کے اصولوں کا پابند ہو۔ یہی وہ تصور ہے جو بظاہر ہندوستان میں بے محل اور دور از کار معلوم ہوتا ہے۔

جس چیز کو ابدی قواعد و ضوابط کا ایک حصہ سمجھ لیا گیا ہے وہ حقیقی صورتِ حال میں اگر مجرمانہ نہیں تو کم از کم بے موقع و محل ثابت ہو رہی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ یہ نصب العین ناقابلِ حصول ہے۔ ایسا پہلے ہو چکا ہے۔ اور پھر کوشش کی جا سکتی ہے۔ ہم پہلے عربوں کا ذکر کرتے ہوئے کہہ چکے ہیں کہ مذہبی قومیں اس صورت میں بھی زندہ رہ سکتی ہیں کہ ان کے عزائم پورے نہ ہوں اور ان کے خواب خواب ہی رہیں۔ مشکل وہاں ہوتی ہے اور پریشانیاں اس جگہ اپنا سر اٹھاتی ہیں جہاں یہ محسوس ہونے لگے کہ نصب العین ناقابلِ حصول ہے، بے معنی ہے یا یہ کہ اس سے آگے بڑھنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ ان تاریخی حقائق سے نبٹنا جو نصب العین کے حصول کی راہ میں روڑا بن رہے ہوں، مذہبی اعتبار سے، زیادہ آسان لیکن اس آئیڈیل کو برتنا جو کھلّم کھلّا تاریخی نشوونما اور ارتقار کو روکتا ہے، بہت مشکل ہے۔

ماضی میں مسلم قومیں مغلوب رہ چکی ہیں، لیکن ایسی صورت میں سارا الزام فاتح پر ہوتا تھا، مزید براں فاتح کی فتح اور غالب کا غلبہ عارضی سمجھا جاتا تھا۔ محکومی کی حالت میں مسلمان آزادی کی امید یا اس کے حصول کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمان آزاد ہیں اور یہی ان کی بڑی الجھن ہے۔ اور وہ اس صورتِ حال میں نہ تو کسی تبدیلی کی امید کر سکتے ہیں اور نہ کسی تبدیلی کے لئے جدوجہد کر سکتے ہیں۔

چند رومانی مزاج رکھنے والے اشخاص، ماضی کی عظمت کا راگ گاتے ہوئے، ہندوستان میں ایک بار پھر مسلم حکومت کے قیام کا خواب دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ چیز، جیسا کہ ظاہر ہے، نہ صرف مادی اعتبار سے حقیقت پسندی کے منافی ہے بلکہ اخلاقی اور روحانی لحاظ سے بھی حقیقت سے کوئی

واسطہ نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس کا مطلب ہوگا کہ چند لوگوں کے ذہنی سکون کے لئے انصاف کا خون کیا جائے۔ کچھ لوگ مایوسی اور ہیجان کے عالم میں یہ کر سکتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے غلبہ کے تصور کو مسئلہ کا حل سمجھ لیں، اپنی آزادی کو خیرباد کہہ دیں اور اپنے آپ کو ایک شکست خوردہ جماعت تصور کرنے لگیں۔ یہ موقف ذمہ داریوں سے فرار کی راہ دکھاتی ہے اور اپنے آپ کو مظلوم سمجھنے کے رجحان کو تقویت بخشتی ہے۔ یہ رجحان نہ صرف یہ کہ مادی پستی اور زوال کی طرف لیجائے گا بلکہ اس میں خودکردہ ذہنی اور روحانی بربادی کے خطرات بھی پوشیدہ ہیں ۔۔۔لات نئی تجربہ گاہ کی طرف بلاتے ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ حاکمیت اور محکومیت کی روایتی درجہ بندیوں کی زنجیریں توڑ دی جائیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی پوزیشن سوویٹ یونین کے مسلمانوں سے مختلف ہے، وہ اگرچہ ایک وسیع غیر مسلم علاقہ میں اقلیت میں ہیں لیکن وہاں وہ کاروبار حکومت میں شریک نہیں۔ واقعات وحالات کی رفتار پر ان کا کوئی اختیار نہیں اور نہ اس کے وہ ذمہ دار ہیں، ترکوں سے بھی ان کا معاملہ مختلف ہے، انھوں نے اپنی آزاد رضامندی کے ساتھ اپنے لئے سیکولر طرز کی اسٹیٹ پسند کی ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ آج کی دنیا میں زندہ رہنے کے لئے سب سے اچھا طریقہ، جو مسلمانوں کو اپنانا چاہیئے، یا ترک مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیئے، یہ ہے کہ سیکولر جمہوریہ قائم کی جائے۔ یہ ان کا اپنا نجی فیصلہ ہے اور اس فیصلہ کے مطابق ان کی جماعتی زندگی ان کا اپنا آزاد فعل ہے۔ یہ سیکولر جمہوریہ جن لوگوں پر مشتمل ہے وہ مسلمان ہیں۔

مسلمانانِ ہند کے لئے یہ سوال بالکل نیا اور گمبھیر ہے کہ وہ کس طرح دوسروں کے ساتھ برابر کی حیثیت سے زندگی گذاریں۔ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور اسلام کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے مسئلہ سے مسلمانوں کو کبھی دوچار نہیں ہونا پڑا۔ اس سے دوسرے اہم سوال اُبھرتے ہیں۔ انسان کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ سماجی اخلاقیات کا کیا مطلب ہے؟ وحی اور سچائی کی کیا حقیقت ہے اور انسان کا دوسرے لوگوں کے عقائد سے کیا تعلق ہونا چاہیئے؟ لیکن ان سوالوں کے بارے میں ماضی کے اسلامی اصولوں اور ان کی تعبیروں سے کوئی فوری رہنمائی نہیں ملتی۔ اور یہ بھی حقیقت

ہے کہ یہ مسائل اور اُلجھ جاتے ہیں جب یہ ہمت شکن حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کے وہ ہندو بھی جو ذات پات کا بھید مانتے ہیں اور جن کے ساتھ مسلمانوں کو رہنا ہے، ابھی اس سے بے بہرہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ کس طرح مل کر رہنا چاہیئے

یہ مسئلہ ہے مشکل ــــ اتنا مشکل کہ ایک لحاظ سے قیامِ پاکستان کو اس مسئلہ کے حل سے بچنے کی ایک کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے بہر حال موجودہ ہندوستانی مسلمان جن کے لئے یہ کوشش تلخ فریب ثابت ہوئی ہے (اور پاکستان کے وجود نے اس مسئلہ کو اور زیادہ مشکل اور پیچیدہ بنا دیا ہے) اس سے فرار نہیں اختیار کر سکتے۔

آج یہ سوال کہ اسلام اور جمہوریت (ڈیموکریسی) میں کیا تعلق ہے پاکستان میں توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے بھی یہ مسئلہ ہے اور اس کے حل کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ موجودہ صدی میں مسلمانوں نے بار بار اس دعوے کو دہرایا ہے کہ اسلام میں جمہوریت ہے، یہ دعوٰی بڑی آسانی سے اور بغیر غور و فکر کئے ہوئے، کیا جاتا رہا ہے اور یہ احساس بہت کم رہا ہے کہ اس کے بعد جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ کتنی زیادہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر سچے مذہب میں جمہوریت کے لئے جگہ ہے کیونکہ اس میں فرد کی اہمیت اور قدر و قیمت، شخصی آزادی اور ذمہ داری بنیادی طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن اس سطح پر غیر مرئی ابدی سچائی اور دنیا میں ایک با اثر، زندہ اور متحرک اخوت اور برادری کے قیام میں جو فاصلہ ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کے لئے جمہوریت بہت نئی ہے۔ ہندوؤں کے لئے بھی یہ نئی ہے اور اسے قائم کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری دنیا کے لئے جمہوری نظام ایک نئی چیز ہے۔ مغرب میں جمہوریت کا جو تجربہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جو کسی قدر کامیابی ہوئی ہے اس کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑی ہے اس لئے جب ہم ہندوستان اور پاکستان میں حالات کی موجودہ رفتار اور مستقبل کے امکانات پر غور کریں تو ہمیں اس جدوجہد اور اس لمبے راستے کو جسے مکمل جمہوریت کی منزل تک پہونچنے کے لئے طے کرنا ہے، یاد رکھنا چاہیئے اور ساتھ ہی ساتھ ان دونوں ملکوں کی پیچیدگیوں، خصوصیتوں اور روایتوں کو بھی فراموش

نہ کرنا چاہیئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں جمہوریت کی منزل کی طرف جو قدم اٹھایا گیا ہے اور وہاں جو حرکت نظر آرہی ہے وہ بڑی دلکش اور جاذبِ نظر ہے اور اس حرکت میں آئندہ مسلمانوں کی شرکت کے جو امکانات ہیں وہ بھی یقیناً بڑے اہم ہیں،

پاکستان میں اقلیتوں کے معاملہ میں مسلمانوں کا جو رویہ ہوگا اس میں ان کے خلوص اور سمجھ بوجھ کی آزمائش ہے، ہندوستان میں یہ آزمائش اکثریت اور پوری قوم کے ساتھ ان کے رویہ سے وابستہ ہے۔ کس حد تک، کس کس طرح اور کن نظریاتی بنیادوں پر مسلمانانِ ہند پوری ہندوستانی قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر سرگرمِ عمل ہوں گے؟ کس طرح وہ اس بات کو محسوس کریں گے اور اس کا اندازہ لگائیں گے کہ ہندوستان میں اسلام کی مادی اور روحانی فلاح و ترقی کا تصور، غیر مسلم ہندوستانیوں کی سرگرمیوں اور وفاداریوں کو نظر انداز کرکے، نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سوالات آسان نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہیں کہا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں نے ان سوالوں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کا مسلمان ہندوستانی بھی ہے اور مسلمان بھی۔ اس دوہری پوزیشن سے انکار کی ہیجانی کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ دونوں حیثیتوں سے ہم آہنگ کرنے کی ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کچھ لوگ بیک وقت ہندوستانی اور مسلمان رہنے میں کامیاب رہے اور انھیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی۔ لیکن اقلیت میں رہتے ہوئے ایک ماڈرن، سیکولر، جمہوریت پسند فرد کی حیثیت سے ایک ہندوستانی کی زندگی میں مذہب اسلام کا کیا مقام ہے اس کی وضاحت ابھی نہیں کی گئی ہے۔ پچھلی صدیوں میں مسلمانوں نے بہت سے مسئلوں کا حل تلاش کیا لیکن ان کی نوعیت اس صورت حال سے بالکل مختلف تھی۔ اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن بالکل انوکھی ہے، وہ بالکل تنہا ہیں۔ ماضی سے انھیں کوئی سہارا ملتا ہوا نہیں دکھائی دیتا۔ انھیں اپنے مسائل خود ہی حل کرنے ہیں۔ ان میں بنیادی حیثیت رکھنے والے دینی، شرعی اور اخلاقی مسائل بھی شامل ہیں۔

آج کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اسلامی اصولوں کی نئی تعبیر کی جو ضرورت محسوس کی جارہی ہے

اس سلسلہ میں مسلمانانِ ہند کو ایک اہم چیز حاصل ہے اور وہ ہے ذہنی آزادی۔ دنیائے اسلام میں غالباً کوئی ملک ایسا نہیں اور شاید ترکی بھی نہیں جہاں مذہبی مسائل کے متعلق ایمانداری اور سنجیدگی سے سوچنے، بے خوفی سے اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور اپنی تحریروں کو شائع کرانے کے لئے اتنا آزاد ہو جتنا کہ وہ ہندوستان میں ہے۔ دوسرے علاقوں میں، خاص طور سے پاکستان اور عرب ممالک میں، سرکاری سنسر اور بلاشبہ اس سے بھی زیادہ اہم سماجی قدامت پرستی اور خودغرض تعصبات کا (جو اکثر منافقت پر مبنی ہوتے ہیں) نہ ختم ہونے والا دباؤ اور خوف آزاد تبادلۂ خیالات اور بحث و مباحثہ کا موقع نہیں دیتا۔ ہندوستان میں اگر کوئی کچھ کہنا چاہتا ہے تو کہہ سکتا ہے خواہ اس کی بات کتنی ہی روایتی یا نئی، کتنی ہی انقلابی یا تعمیری ہو۔ مسلمانوں کے غیر حل شدہ مسائل کے تقاضے ہی نہیں بلکہ قومی اسلامی پالیسی اور سرکاری مسلم اداروں کی عدم موجودگی بھی ذہنی آزادی کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ اس ذہنی آزادی کو مزید تقویت ملتی ہے ہندوستان میں تہذیبی "تخلیقیت" اور رواداری کی قدیم اور سنجیدہ روایات اور انگریزی عہدِ حکومت میں لبرل ازم (Liberalism) کی اشاعت سے۔

دوسرے مسلم ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی مذہب اور عہدِ حاضر کے مابین تعمیری نقطۂ نظر سے کوئی میل نہیں قائم کیا جا سکتا جب تک کہ عہدِ حاضر کی خصوصیات کا قریب سے مکمل مطالعہ کرنے کا مصمم ارادہ نہ کیا جائے۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادگی اور خواہش بہت ضروری ہے۔ انسانی دانش مندی کا آخری مرحلہ خدا کی معرفت ہے لیکن پہلی منزل حقیقتوں کا سامنا کرنا اور انھیں پہچاننا ہے۔

مزید براں، اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ کچھ مسئلے ہیں جو اپنے حل کے منتظر ہیں۔ ماضیِ قریب کی اسلامی تاریخ میں یہ احساس بہت کم ملتا ہے۔ مسلمانوں نے یہ مان لیا ہے اور اس کا انھیں یقین ہے کہ سارے مسائل پہلے ہی حل کر دئے گئے ہیں، زندگی کے سارے تقاضوں کا جواب کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی انداز میں دیا جا چکا ہے اور اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ازسرِنو ذہن

کی تخلیقی قوتوں سے پھر ان پر غور کیا جائے ۔ اس نقطۂ نظر سے بہت سے مسلمانوں کے دل و دماغ کو بالکل مقید کر دیا ہے۔ قرآن کے متعلق یہ خیال محکم ہوگیا ہے کہ وہ ایک "مکمل" نظام پیش کرتا ہے جسے محض عمل میں لانے کی ضرورت ہے ۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ قرآن درحقیقت ایک امرِ خداوندی ہے جس کے سہارے "تکمیل" کی منزل تک پہونچا جاسکتا ہے ۔ اسلامی قانون اور اسلامی تاریخ کے بارے میں، جنھیں ماضی میں دشواریوں سے نبرد آزما ہونے کا ایک حوصلہ بخش ریکارڈ سمجھنا چاہئے، دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا ہے کہ آج کی ساری مشکلوں کا مداوا ان میں موجود ہے، بس اس کی ضرورت ہے کہ اس خزانے سے نظیریں نکال نکال کر موجودہ مسائل پر چسپاں کر دی جائیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب نے انسانی رویّے اور اعمال کو محدود کر دیا ہے اور نئے رویّے اور نئی سرگرمیوں کی راہ میں یہ انسانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں کی بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو ایک « بند » نظام تصور کرلیا ہے اور نہ صرف باہر کی سچائیوں کے لئے بلکہ باہر کے لوگوں کے لئے بھی اس نظام کے دروازے بند ہیں۔ مسلمانانِ ہند یعنی ہندی اسلام سے بڑی امید ہے کہ وہ ان حدود کو توڑ دیں گے ۔ یہ مجبور ہو سکتے ہیں کہ نئی نظر و فکر کی تلاش کی جرأت کریں ۔ یہ اس حقیقت کو پا سکتے ہیں کہ دوسری مذہبی جمعیتوں کے ساتھ مل کر ایک عالمگیر برادری کے قیام کی طرف عالمِ انسانی کی رہنمائی کی جاسکتی ہے ۔

ہندی مسلمانوں کے متعلق اِن امکانات کی اہمیت بہت زیادہ ہے نہ صرف ان کے اور ہندوستان کے حق میں (جسے اپنے تمام عناصر کی وفاداری اور تعمیری قوتوں کی ضرورت ہے) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ساری دنیائے اسلام کے لئے ۔ مسلمانوں کی یہ جماعت بظاہر اسلامی دنیا سے الگ تھلگ ہے بلکہ دو معاملوں میں یہ دنیا بھر کے مسلمانوں، بلکہ ساری دنیائے انسانیت، کی نمائندہ ہے ، ایک تو یہ کہ اسے ترقی کی ضرورت ہے اور ترقی کی ضرورت دنیا کے تمام مسلمانوں کو ہے لیکن دوسری اس کی اپنی خاص خصوصیت ہے ۔ آج کی دنیا میں اسلام سے جو تقاضے کئے جا رہے ہیں ان میں سے ایک کی جواب دہی کی ذمہ داری پاکستان پر ہے یعنی عصرِ حاضر کی زبان میں سماجی انصاف

کے مفہوم کو منتقل کرنا۔ دوسری ذمہ داری ہندوستان کے اسلام کی ہے یعنی اسلام سے باہر جو عناصر ہیں ان سے نباہ کرنے اور ہم آہنگ رشتہ قائم کرنے کی ضرورت۔ ہم یہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی مختلف جمیعتوں میں مسلمانانِ ہند کی پوزیشن انوکھی ہے۔ یہ لوگ آزاد لیکن تعداد کے لحاظ سے مغلوب جماعت کی مخصوص حیثیت سے حیات نو کے مسائل سے دو چار ہے۔ لیکن اگر پوری دنیا کو سامنے رکھا جائے تو پورے عالم اسلام کی یہی حیثیت ہے۔ اس زمانے میں تہذیبوں کی اضافی خود مختاری ختم ہو چکی ہے۔ آج ہر تمدن کا یہ فرض ہو گیا ہے کہ وہ ہم آہنگی اور مناسبت و موافقت کے عنصر کو ترقی دے۔ غالباً اس سلسلہ میں "مغرب" کو زیادہ سیکھنا ہے لیکن دراصل کوئی تہذیب اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ماضی میں تہذیبیں الگ تھلگ، باہم متصادم یا متقارب رہی ہیں لیکن اب ہمیں اشتراک و تعاون سے رہنے کا سبق سیکھنا ہے۔ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کی طرح اسلام کو بھی اس معاملہ میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہیئے اور شاید یہ چیز ہمیں ہندوستان میں ملے گی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی وہی پوزیشن ہے جو دنیا میں سارے مسلمانوں کی ہے یعنی ایک اہم اقلیت کی حیثیت۔ ماضی میں جو کچھ انھیں ملا ہے وہ، ان کی اپنی قدریں، مستقبل کے لئے ان کی امیدیں اور حوصلے ــــ سب ان کے اپنے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے مسائل کا تعلق ہے اس میں ہم بھی ان کے شریک ہیں۔ انھیں اپنا پارٹ ادا کرنا ہے لیکن اسے ایک بڑے دائرۂ عمل سے مل جانا چاہئے جس میں مختلف النوع خصوصیات کے حامل وہ لوگ بھی شریک ہیں جو اکثریت میں ہیں اور غالباً زیادہ طاقتور ہیں اور جن کی قدریں دوسری اور جن کا پارٹ مختلف ہے۔ دنیا کے عام مسلمانوں بلکہ دوسری انسانی جمیعتوں کی طرح مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا انحصار ان کے اپنے داخلی ذرائع، عقائد، تخلیقی صلاحیتوں اور دوسرے انسانوں سے خارجی تعلقات کی نوعیت پر ہے

ادبیات

غزل

از
(جناب شارق میرٹھی ایم۔اے)

کچھ اور ہے وہ میکدۂ عام نہیں ہے
ہر ایک کے حصّے کا جہاں جام نہیں ہے

ہے دل میں خلش، لب پہ ترا نام نہیں ہے
خوش ہوں کہ مرا ذوقِ طلب خام نہیں ہے

راس آگیا جس کو خمِ گیسوئے محبت
پھر اُس کے لئے گردشِ ایام نہیں ہے

قسمت ہی سے ملتا ہے کسی اہلِ وفا کو
وہ سوزِ دروں جس کا کوئی نام نہیں ہے

اے صاحبِ مے خانہ مجھے اتنا بتادے
میرے ہی لئے بزم میں کیوں جام نہیں ہے

سمجھے گا وہ کیا حال اسیرانِ قفس کا
جو طائرِ آزاد تہِ دام نہیں ہے

یہ سوزِ محبت وہ کہانی ہے کہ جس کا
آغاز ہی آغاز ہے انجام نہیں ہے

معلوم ہوا مٹ کے مجھے راہِ طلب میں
ہر جادۂ غم منزلِ آرام نہیں ہے

ہے تلخیٔ غم بھی مرے اشعار میں شارق
اس خم میں فقط بادۂ خیام نہیں ہے

غزل

از
(جناب اعجاز احمد خاں صاحب اعجاز شاہجہاپنوری)

یہی اک جہاں کیا، جہاں اور بھی ہیں
زمیں اور بھی، آسماں اور بھی ہیں

جو اک کارواں لٹ گیا بھی تو کیا غم
سرِ رہ گزر کارواں اور بھی ہیں

وہ جن سے تھی امید چارہ گری کی
مرے غم پہ وہ شادماں اور بھی ہیں

بلا سے مری، پھونک دو آشیاں کو
جہاں میں مرے آشیاں اور بھی ہیں

ستم کیش تنہا فلک ہی نہیں ہے
ستم کے لئے آسماں اور بھی ہیں

شکستِ تمنا سے تھک کر نہ رہ جا
ابھی راہ میں امتحاں اور بھی ہیں

جو اشکوں نے اظہارِ غم کر دیا ہے
تو مجھ سے وہ اب بدگماں اور بھی ہیں

ہم اعجاز اُن کے ہیں اُن کے سبب سے
ہمارے لئے آستاں اور بھی ہیں

تبصرے

اسلامی کشکول | از جناب قاضی مظہر الدین احمد صاحب بلگرامی استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ تقطیع متوسط کتابت وطباعت بہتر ضخامت ۳۰۸ صفحات پتہ :- کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

اسلام کی مختلف تعلیمات پر مختلف نقطہائے نظر سے چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں اردو میں لکھی جاچکی ہیں لیکن چونکہ لائق مصنف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں استاد ہیں اور اسی لئے ان کو معلوم ہے کہ مسلمان نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کی کن کن تعلیمات کے متعلق کیا کیا شکوک وشبہات رکھتا ہے اور ان کے جوابات کیا ہیں۔ اس لئے موصوف نے یہ کتاب دراصل اسی طبقہ کو سامنے رکھ کر لکھی ہے۔ چنانچہ ابتدا میں عقلِ انسانی کی نارسائی اور کوتاہ دامنی اور مذہب کی ضرورت پر بحث کرنے کے بعد توحید ورسالت۔ قرآن وحدیث وفقہ کے علاوہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور بحث کا انداز یہ ہے کہ پہلے ہر مسئلہ کی اصل حقیقت قرآن وحدیث کی روشنی میں متعین کرتے ہیں اور اُس کے بعد مصنفین ومفکرینِ مغرب کی عبارتوں سے اُس کی تحسین وتصدیق کرتے اور اس سلسلہ میں جو عقلی شکوک وشبہات پیش آتے ہیں ان کے جوابات دیتے جاتے ہیں کتاب کے آخر میں مآخذ کی جو فہرست ہے اُس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قاضی صاحب نے اس کتاب کی ترتیب میں کتنی محنتِ شاقہ برداشت کی ہے۔ یہ کتاب اسی لائق ہے کہ اسلامی مدارس کے نصابِ دینیات میں شامل کی جائے

محبوب کبریا کی آمد | از جناب سید اشفاق حسین رضوی تقطیع خورد ضخامت ۵۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ؔ۔ کوچہ میر انیس لکھنؤ کے پتہ پر مصنف سے ملے گی۔

مضمون کے اعتبار سے تو اس کتابچہ میں وہی باتیں ہیں جنھیں ہر مسلمان جانتا اور جن کا اعتقاد رکھتا